تبصرے

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظرثانی کی ضرورت از جناب آصف بن علی اصغر فیضی تقطیع کلاں ضخامت ۳۲ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت ۸ ر پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی -

جناب آصف بن علی فیضی ملک کے مشہور مصنف ہیں - انگریزی میں اسلامی قانون پر متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں - موصوف نے ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں اسلامیات پر جو ایک کانفرنس ہوئی تھی اس کے لئے ایک مقالہ بزبان انگریزی لکھا تھا - یہ رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے - اصل رسالہ ہماری نظر سے نہیں گذرا - لیکن اس کا پیشِ نظر ترجمہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے زیادہ واضح اور صاف نہیں ہے - لایق مصنف نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی مذہبی پالیسی کا سرسری تذکرہ کرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی سے لے کر اب تک اس ملک میں جو مسلمان مفکر اور مشاہیر علماء پیدا ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ مفکرینِ اسلام کا طریقِ فکر بھی بدلتا رہا ہے اور انھوں نے اس کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی تطبیق جدید حالات کے ساتھ کریں - اس کے بعد ہندوستان کی موجودہ سیاسی تشکیل اور یہاں کے دستور کی سیکولر حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیئے " ؟ اگر بات یہیں تک رہتی تو نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا بلکہ بلاشبہ وقت کی ایک اہم ضرورت پر توجہ دلانے کی دعوت ہوتی - امام ابو یوسف کا قول ہے کہ جو شخص اپنے زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو اس کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے - اسی لئے بیدار مغز علماء اور روشن خیال سلاطینِ اسلام نے ہر دور میں اس کی کوشش کی ہے کہ وقت کے جدید مسائل و معاملات پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں غور و خوض کیا جائے اور ان کا ایسا حل تلاش کیا جائے کہ ایک طرف اسلام کی کسی اصل پر اُس کی زد نہ پڑے اور دوسری جانب مسلمان جمود کا شکار ہو کر زندگی کی تگ و دو میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں یا کم

ازکم وقت کے مطالبات کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا نہ کرسکیں۔ چنانچہ آج علمائے کرام کے ایک حلقہ میں فقہ کی تدوینِ جدید کا جو غلغلہ بلند ہے وہ درحقیقت اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ علاوہ بریں فقہ کے مسالکِ اربعہ میں سے فقہ حنفی کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز جس کے باعث اس کو عجم کے متمدن ممالک میں فروغ و عروج ہوا یہ ہی ہے کہ وہ کبھی وقت کے نئے مسائل کا کامیاب حل تلاش کرلینے میں ناکام نہیں رہا۔

لیکن افسوس ہے کہ لایق مقالہ نگار نے بات یہیں تک محدود نہیں رکھی بلکہ اور آگے ترقی کرکے وہ سرے سے اسلام کے اصول اور اس کے بنیادی آئین و قوانین میں ہی کاٹ چھانٹ اور تراش وخراش کے قائل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ شروع میں ہی لکھتے ہیں :-

"اب اس کی ضرورت ہے کہ شرعی اصول اور مذہب کے اس دعوی پر کہ خدا ہی قانون کا مصنف ہے تاریخی اور فلسفیانہ پہلو سے ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔ اس تنقید میں اس امر کو واضح کرنا چاہیئے کہ سامی اقدام میں قانون کا منبع خاص طور پر خدا ہی کیوں سمجھا جاتا رہا۔ بعد کو اس کے کیا نتائج ہوئے۔ کس لئے اب دیگر اصول قانون۔ سیاسی نظریات اور بین الاقوامی تعلقات کے ذہنی ارتقار کے زیر اثر بتدریج اسلامی سوسائٹی میں مذہبی اور دنیاوی قانون کے مابین واضح امتیاز ہونا چاہیئے۔" (ص ۳)

"مقالہ نگار کو "اسلامی سوسائٹی میں مذہبی اور دنیاوی قانون کے مابین واضح امتیاز" پیدا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اس کا جواب بھی خود انھیں کی زبان سے سُنئے فرماتے ہیں "راقم الحروف کو پورا یقین ہے کہ ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو کسی قوم کی سماجی زندگی سے متعلق کسی قدیم اصول پر مبنی ہیں رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہوجائیں گے اور یا ان میں اتنی تبدیلی ہوجائے گی کہ قوانین کی ایک ایسی عام اسکیم کے ماتحت جو ہر شخص پر بلا لحاظ مذہبی اختلاف کے عائد ہو۔" (ص ۲۵)

یہ امتیاز کیوں کر ہوسکتا ہے موصوف نے اس کا بھی جواب دیا ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے چند اصول بیان کئے ہیں جن میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ "مذہب کے اصول و معتقدات کو قانون کے اصول و ضوابط سے الگ کیا جائے۔" (ص ۲۷) اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مذہب کو صرف

عبادات تک محدود کر کے رکھ دیا جائے اور سماجی، اقتصادی، سیاسی اور دوسرے مسائل میں صرف ملکی قانون کی پیروی کی جائے تو ظاہر ہے کہ اسلام کا کیا ذکر کہ وہ تو دین اور دنیا دونوں ہی سے متعلق مکمل نظامِ زندگی کا نام ہے۔ دنیا کا کوئی زندہ مذہب بھی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ کمال آتاترک نے ٹرکی میں اس کا تجربہ کیا تھا لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ سرے سے مذہب ہی ختم ہو گیا۔ اور آج وہ مذہب وہاں پھر زندہ ہو رہا ہے یہ تو کوئی بتائے کہ اس نے دنیوی اور سیاسی ترقیوں میں کون سا رخنہ ڈالا، جیسا کہ ہم نے بتایا بے شبہ وقت کے جدید مسائل مثلاً بنیک کا سود، بیمہ، سرکاری قرضہ۔ قسطوں پر خریداری وغیرہ ان سب کا جواب اسلام کو دینا چاہیئے لیکن اسلام اس اصول کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ مذہب کو عام قانون سے الگ رکھا جائے ورنہ پھر مذہب کا وجود ہی باقی نہیں رہتا ہے غالباً آصف فیضی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر آج ملک میں وراثت یا بین الاقوامی شادی۔ یا شادی کے لئے بعض خاص خاص شرائط کا کوئی قانون بنتا ہے تو وہ صرف ہندوؤں کے لئے نہ ہو بلکہ اس کا اطلاق مسلمانوں پر بھی ہونا چاہیئے۔ اگر واقعی ان کا مطلب یہی ہے تو قطع نظر اس سے کہ کوئی مسلمان اس کو تسلیم نہیں کر سکتا سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر سیکولرازم کی حقیقت کیا ہو گی؟ اور اس دردسری کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایک غیر مذہبی قانون کو بے شک قبول کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ وہ کسی مذہبی اصول سے متصادم نہ ہو مثلاً انکم ٹیکس اور صنعتی و حرفتی قوانین نائنز ایکٹ۔ ایکویزیشن آف امو ابیل پراپرٹی ایکٹ وغیرہ وغیرہ۔

جیسا کہ شروع میں ہی کہا گیا ہے اس مقالہ کی زبان اور انداز بیان اس قدر الجھا ہوا ہے ——— ممکن ہے اُس کی وجہ یہ ہو کہ مصنف کھل کر اپنا مدعا ظاہر کرنے کی جسارت نہیں کر سکے اس لئے انھوں نے مجبوراً چبا چبا کر گفتگو کی ہے ——— کہ بعض جگہ تضاد بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی ضرورت ہے اور دوسری جانب وہ خدا کے وجود اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے عقیدہ تک کو نظر ثانی کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ (صلا۳) پھر موصوف نے شریعت اور علم الکلام

میں بھی التباس پیدا کر دیا ہے۔ شریعت نام ہے ان احکام و مسائل کا جو ایک انسان کی معاشی اور معادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ احکام و مسائل مختلف قسم کے ہیں بعض فرض بعض واجب اور بعض مستحب و مباح یا حلال حرام اور مکروہ ہیں۔ اس کے برخلاف علم الکلام نام ہے ان احکام کی نقلی و عقلی توجیہ کا۔ جہاں تک توجیہ کا تعلق ہے تو بے شبہ جدید علوم و فنون کی روشنی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک نیا علم کلام مرتب کریں اور اس میں جدید سائنس اور فلسفہ سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح یقین ہے کہ ہم اسلامی اصول حیات اور اس کی تعلیمات کو حق ثابت کرنے کے لئے زیادہ مؤثر، پائیدار اور قوی تر دلائل مہیا کر سکیں گے۔ لیکن جہاں تک شریعت کا یعنی اسلام کے ان احکام کا تعلق ہے جو قرآن و حدیث میں منصوص ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً قرآن نے وراثت کا، نکاح و طلاق کا، ماکولات و مشروبات کا، شخصی حقوق کا، عبادات و معاملات کا جو قانون مقرر کر دیا ہے اور احادیث صحیحہ نے اس قانون کی جو تشریحات و تنقیحات متعین کر دی ہیں ان میں کوئی کسی قسم کی کتر بیونت یا ترمیم و تنسیخ نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ قوانین اسلام کے اصول موضوعہ ہیں اور ان میں تبدیلی کا حق سوائے بانی شریعت یعنی پیغمبر کے اور کسی کو نہیں ہے۔ ہاں بے شک اگر اسلام ایک جامع نظام زندگی اور ایک مکمل دین فطرت و انسانیت ہے تو اسے ہر مرحلہ پر یہ ضرور ثابت کرنا ہوگا کہ اس کی کوئی تعلیم اور اس کا کوئی قانون کسی بہتر سماجی، اقتصادی یا اجتماعی اصلاح کے مزاحم یا اس کے متناقض تو نہیں ہے۔ یہ کام علماء کے کرنے کا ہے اور انھیں لازمی طور پر کرنا چاہیئے۔ لیکن اسلام اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا ہے کہ چوں کہ کسی ملک کے مسلمانوں کو اس ملک کی دوسری قوموں کے ساتھ مل کر ایک عام سوسائٹی یا "متحدہ قومیت" بنانی ہے اس بنا پر مسلمان اپنے پرسنل لا سے دست بردار ہو جائیں۔ اور اندھا دھند سوسائٹی کے عام قوانین کو اختیار کر لیں

اس بحث سے قطع نظر فاضل مصنف نے بعض کام کی اور مفید باتیں بھی کہی ہیں۔ مثلاً جدید علم الکلام کی ترتیب و تدوین۔ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ۔ مذاہب کی تاریخی بنیادوں کا مطالعہ۔ سامی زبانوں کا مطالعہ اور ان کی مشترک لسانیت۔ نظریۂ تخلیق عالم کی از سر نو تشریح۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جن کی اس زمانہ میں اسلام کو ایک سائنٹفک حقیقت ثابت کرنے کے لئے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی کے بارہ میں انھوں نے یہ بڑی کھری اور کام کی بات لکھی ہے کہ "عام طور پر مغل بادشاہوں نے اپنی ہندو رعایا پر ہندو قانون عائد کیا اور مسلم رعایا پر اسلامی قانون۔ مسلمان بادشاہوں نے جو حنفی قاضی مقرر کئے ان کے ساتھ ہمیشہ پنڈت اور مفتی ہوتے تھے جو دھرم یا شریعت کے پیچیدہ مقدمات میں ان کی مدد کرتے تھے۔ (ص ۴) اسی طرح اردو زبان کی نسبت ان کا یہ ارشاد بہت قیمتی اور لائق قدر ہے کہ "مجھے یقین ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتدائی تاریخ کا سمجھنا عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی طرح اسلامی نظر و فکر کی موجودہ رفتار کو سمجھنا اردو زبان سے واقفیت کے بغیر ناممکن ہے اس لئے کہ اس زبان میں مذہبی تالیفات فارسی یا ترکی سے زیادہ ہیں۔ (ص ۸)

پھر یہ بھی مصنف کی بے تعصبی اور شرافت کی دلیل ہے کہ انھوں نے انتہا پسند جدید الخیال ہونے کے باوجود مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور مولانا شاہ اشرف علی رحمۃ اللہ علیہما جیسی قدامت پسند شخصیتوں کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ بہرحال اگر اس مقالہ کا فائدہ یہ ہوا کہ علمائے کرام محسوس کر سکے کہ اب ملک کے موجودہ حالات میں ہوا کا رخ کیا ہے اور ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس وقت کس ذہنی کشمکش و

اضطراب میں مبتلا ہے اور اس کا تدارک کرنے کے لئے ان کا خود اپنا کیا فرض ہے تو ہم سمجھیں گے کہ یہ مقالہ بے اثر نہیں رہا اور وہ بہت مفید ثابت ہوا۔